© rasailojaraid.com

از پروفیسر غلام رسول عدیم

اقبال

تہذیبِ مغرب کا بے باک نقاد

برسوں اور سالوں میں نہیں صدیوں اور قرنوں میں کسی قوم میں کوئی ایسی شخصیت جنم لیتی ہے جس کے لیے نسلِ انسانی عمروں منتظر رہتی ہے اور جب وہ شخصیت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے تو صدیوں اس کی یاد ذہنوں کو معنبر رکھتی، سوچوں کو اجالتی فکر کی آبیاری کرتی اور دلوں کو گرماتی اور برماتی رہتی ہے ۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

یہاں پیغمبرانِ الٰہی خارج از بحث ہیں کہ وہ چیدہ اور برگزیدہ ہوتے اور منصبِ اصطفاء و اجتبار پر فائز ہوتے ہیں وہ از خود دعوتِ فکر و عمل لے کر نہیں اٹھتے بلکہ ان کے پاس اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک بنا بنایا پروگرام ہوتا ہے اور وہ خود بھی بنے بنائے آتے ہیں۔ اپنی ریاضت و اکتساب سے نہیں بنتے ۔ بھیجنے والے کی مرضی ہے کہ وہ کس کو کس خطے میں، کن لوگوں کی طرف اور کس زمانے میں بھیجے۔ وہ ایک طرف مامور من اللہ ہوتے ہیں تو دوسری طرف آمر بامر اللہ ۔ خالق کے مطیع ، مخلوق کے مطاع ، خلق کے قائد ، خالقِ کائنات کے منقاد ۔ بات ان شخصیات کی ہو رہی ہے جو الٰہی پروگرام ان معنوں میں نہیں رکھتے جن معنوں میں فرستادگانِ الٰہی رکھتے ہیں بلکہ وہ جنہیں خالقِ کائنات دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازتا ہے اور پھر ان ...

... کا کام لیتا ہے ۔ ان کا علمی بلوغ ، ان کی فکری جولانیاں ، ان کی مثبت اور توانا سوچ ایک عالم کو گمراہی اور عملی بے راہ روی سے نکال کر جادۂ مستقیم پر لگا دیتی ہے ۔

علامہ اقبال کی عظیم شخصیت ایسے ہی اساطینِ عالم میں سے ایک ہے جو در ماندہ و پا بہ گل ہجوروں کو منظم گروہوں کی شکل دے کر جادہ پیمائی کا شعور بخشتے ہیں ۔ اقبال نے بھی اس بلند آہنگی سے اور سوز و دروں سے حدی خوانی کی ۔

صدیوں کے مسافر لمحوں میں منزل شناس ہوتے نظر آئے ۔ یہ وہ کارواں تھا جو بطحا کی وادی سے نکلا اور اطرافِ عالم میں ہر چہار جانب پھیل گیا ۔ حدودِ برصغیر میں پہنچا تو آٹھویں صدی عیسوی کا آغاز ہو چکا تھا ۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک برصغیر کی سیادت و قیادت اس جہاں سپار گروہ کے ہاتھ میں رہی ۔ گردشِ ایام اور زندگی کے نشیب و فراز نے اسے کبھی فرمانروائی کی مسندِ بالا پر بٹھایا تو کبھی پستی و زوال کے عمیق غاروں میں دھکیل دیا ۔

۷۱۲ء میں محمد بن قاسمؒ نے سندھ و ہند میں اسلام کا پھریرا لہرا کر عقائدِ باطلہ اور توہمات میں جکڑے ہوئے سماج کو فکر و نظر کی آزادی بخشی ۔ بعد ازاں منصورہ اور ملتان میں مسلم حکومت قائم ہوئی ۔ اگرچہ اس کا اثر و نفوذ زیادہ دور تک نہ پھیل سکا اور وہ برصغیر کے شمال مغربی حدود و ثغور سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ تاہم تین سو سال بعد روشنی کا ایسا سیلاب امڈا کہ شمالی دروں کی راہ آنے والے غزنویوں اور غوریوں نے اس کفرستانِ ہند میں غلغلۂ توحید سے دیومالائی اور اساطیری ضعیف الاعتقادی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ۔

جب ۱۲۰۶ء میں برصغیر میں حکومتِ اسلامیہ کے اصل بانی سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کو مستقل مستقر بنا کر گجرات کاٹھیاواڑ کالنجر اور بنگال تک یلغار کی تو اس امر کا یقین ... برصغیر میں اسلام کا پرچم لہراتا ہے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اگرچہ ۱۸۵۷ء تک کوئی ڈیڑھ سو برس تک اسلامی حکومت قائم رہی مگر فی الجملہ یہ دَور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے انحطاط و تنزل کا دَور نافرجام تھا۔ سیاسی افراتفری، معاشرتی ناہمواری اور اقتصادی بدحالی نے مسلمانوں کی عظمت کو گئے دن کا قصہ بنا کر رکھ دیا۔ سات سمندر پار سے آنے والے سفید فام مگر سیاہ دل فرنگی کی دسیسہ کاریوں نے مسلمان سے حمیت و غیرت چھین کر اسے تملق و مداہنت کا خوگر بنا دیا۔

اس دَور میں بعض دھڑکتے دل والے مصلحین نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ مسلمانوں کو ان کی اسلامی عصبیت سے آگاہ کیا۔ ان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ، سید احمد بریلویؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، سرسید احمد خاں، حاجی شریعت اللہؒ اور تیتو میرؒ جیسے جد آمادہ پیکرانِ عزیمت نے فضا میں ایمان و ایقان کی سرمستیاں بکھیر دیں اور مسلمانانِ برصغیر کو خودشناسی کا درس دیا۔

لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمان اس حد تک پستیوں میں اُتر چکے تھے کہ اب ان کا تنزل کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یوں بیسویں صدی کے آتے آتے مسلمان اس درکِ اسفل تک پہنچ چکے تھے کہ انہیں انگریزی استبداد سے نجات دلانے کے لیے اعجازِ مسیحائی رکھنے والی ایسی سحرآثار شخصیت کی ضرورت تھی جو اسے اپنی شناخت کرا سکے۔ نہ صرف عرفانِ ذات بخشے بلکہ یہ باور کرائے کہ تم انہیں اسلاف کے وارث ہو جنہوں نے قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں کو پامال کر کے رکھ دیا تھا جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کوہ و صحرا لرزتے تھے۔ جو ان بلاخیز طوفانوں سے بڑھ کر تھے جن سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے اور جن کی یلغاروں سے کوہ پائریز کے اس پار ایسا ارتعاش پیدا ہوا کہ مدتوں یورپی اقوام اس کے اثرات محسوس کرتی رہیں۔

اب وقت آن پہنچا تھا کہ وہ عیسیٰ نفس غلاموں کے لہو کو گرمائے اور کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کر دے۔ چنانچہ بیسویں صدی نے بڑھ کر اس مسیحا نفس کا استقبال کیا۔ سچ ہے کہ جب تاریکیاں گہری ہو جائیں تو ٹمٹماتا ہوا دیا بھی قندیل بن کر جگمگاتا ہے لیکن اگر واقعی فانوس روشن کر دیا جائے تو اس کی امواجِ نور سے یقیناً تاریکیاں کافور ہو جائیں گی اور پورا ماحول نور میں نہا جائے گا۔ وہ فانوس فروزاں ہوا۔ یعنی چھٹی وہ رجلِ عظیم آیا۔ اس نے ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار کھینچا۔ انبوہِ خفتہ کو اپنی بانگِ درا سے جگایا۔ عروقِ مردۂ مشرق میں زندگی کا خون دوڑا دیا۔ اس شان سے صورِ اسرافیل پھونکا کہ صدیوں کی رُوحیں زندگی کی توانائیوں سے سرشار ہو کر انگڑائیاں لینے لگیں۔ کارواں کو پھر سے منزل کی طرف گامزن ہونے کا حوصلہ ملا۔

اس رجلِ رشید کی بوقلموں شخصیت میں یوں تو ایک بیدار مغز سیاست دان کا تدبر، ایک حلیم و بردبار انسان کا جگر، ایک عظیم و جلیل شاعر کا تنوع اور ایک عظیم فلسفی کا ماورائی ادراک تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی حقیقی وجہِ مجد و شرف اور اصلی اثاثہ وہ اندازِ نظر ہے جس نے اسے ذاتی حیثیت سے اٹھا کر کائناتی فکر کا مالک بنا دیا۔

اس نے ایک خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہجوم کو جگایا اور منظم جماعت کی صورت دے دی۔ قوم کا وہ تصور دیا جس سے مغرب نابلد تھا

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی

اقبال سے پہلے سرسید احمد خاں کے عظیم رفقاء میں حالیؔ نے قومی سوچ کو نیا اُٹھان گر حالیؔ کی آواز میں اس قدر دھیماپن تھا کہ اکثر لوگوں نے سنی ان سنی کر دی۔ بلاشبہ اس آواز میں سوز تھا مگر گھن گرج نہ تھی خلوص تھا مگر محدودیت کے ساتھ دردمندی [illegible] میں یوں حالیؔ کی قومی فکر مایوسیوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نذر ہو گئی۔ وہ ایک گہرے کنوئیں کی طرح تھی جو کبھی تہ کے چشموں کے ابلنے سے جوش تو مارتا ہے مگر اس میں سمندر کی طغیانی اور تلاطم انگیز موجوں کی روانی نہیں آسکتی۔ نتیجہ یہ نکلا حالی کی گریہ و زاری یاس خیزیوں تک آکر رہ گئی۔ تاہم شیونِ تری اکارت نہیں گیا۔ اقبال نے حالی کی رکھی ہوئی نیو پر ایک فلک بوس ایوان کھڑا کر دیا۔ حالی علومِ جدیدہ سے ناواقفیت کی بنا پر گہرائی کے باوجود گیرائی سے محروم رہے۔ آفاقی وسعت کے فقدان کے باوجود اقبال نے حالی کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا ؎

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دارم

حالی کے زمانے میں اس شور کو زیادہ نہیں سنا گیا مگر اقبال نے نوائے حالی سے تحریک پاکر فضا میں غلغلہ اندازی کا سامان پیدا کر لیا۔

اقبال کے مجد و شرف کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اس نے مشرق و مغرب کو پڑھا۔ پڑھا ہی نہیں خوب کھنگالا۔ اس قدر جانچا اور آنکا کہ اپنی مشرقیت کو مغربیت کی زد میں نہ آنے دیا۔ پچھلی دو صدیوں سے عموماً اور عصرِ حاضر میں خصوصاً مغرب نے اپنے مادی استیلاء اور ظاہری وسائلِ حیات سے پوری دنیا کو خیرہ کر دیا ہے۔ جدید سائنسی پیش رفت اور ٹکنالوجی نے ہر سطح بین کے دل میں مغربیت کے علمی بلوغ و بزوغ کا نقش جما دیا۔ جو شخص ایک بار لندن کی ہوا کھا آیا فرنگی فکر کا پرستار پایا گیا۔ جس نے پیرس کی ہموار اور گداز سڑکوں پر گھوم پھر لیا اُسے دلی کے وہ کوچے اجنبی سے لگنے لگے جن کے بارے میں شاعر نے کہا ؎

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

جس شخص نے نیویارک کی ایوے نیو روڈ [illegible]
نے جانا گویا وہ فردوسِ بریں کی سیر کر آیا۔ اب لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر چلتے ہوئے اُسے اُلجھن محسوس ہونے لگی۔ زبانِ حال ہی سے نہیں زبانِ قال سے پکار اٹھا

ع فرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

مگر زمانہ معترف ہے کہ اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان گیا۔ کیمبرج کے محققینِ عصر اور نامورانِ دہر سے خوشہ چینی کی۔ ان عمائدِ علم و فضل سے استفادہ کیا جو علوم و فنون میں ماہرانہ دستگاہ ہی نہیں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ جرمنی پہنچا تحقیق و تدقیق اور علم و حکمت کی پُر خار وادیوں میں آبلہ پا دیوانوں کی طرح قدم فرسائی کی۔ بلادِ فرنگ میں ۳ سالہ قیام کے دوران میں پالا کی سردی میں بھی سحر خیزی کا التزام رکھا ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

ایک طرف علم و آگاہی کے جواہر ریزے سمیٹے تو دوسری طرف مغرب کے تمدن کو محققانہ و ناقدانہ نگاہ سے دیکھا۔ سطح بینوں کی طرح نہیں اندر جھانک کر اُن کے آدابِ زیست کا بغور جائزہ لیا۔ اُن کے آدابِ معاشرت کے محاسن و معائب پر نگاہ ڈالی۔ اُن کی سیاسی فکر پر پہروں غور کیا۔ فرنگی اقوام کی مذہبی سطحیت اور دین بیزاری کو آنکا اور پرکھا۔ ان کے اقتصادی نظام کا بغور مطالعہ کیا۔ غرض ان کے تمدنی نظام کے ایک ایک جزیئے کا استیعاباً مطالعہ کیا۔

اب وہ موقع پرست اور بیرونِ در تک رہنے والا نہ تھا درونِ در کے ہنگاموں سے بھی باخبر تھا۔ لہٰذا اُس کے سینے میں اس تمدن کے خسارت اندوز پہلوؤں کے خلاف لاوا پکتا رہا۔ فرنگی حضارت اور مغربی تہذیب جس پر مغرب کو خود بہت ناز تھا اور اوپری نظروں سے دیکھنے والے اہلِ مشرق بھی اس پر تحسین کے ڈونگرے برساتے تھے اقبال کی نظر [illegible] اس نے کئی موقعوں پر اس تہذیب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خلاف گہرے معاندانہ جذبات کا اظہار بھی کیا۔

سیاسی فکر میں اقبال نے یورپی تصورِ قومیت کو نہایت ناپسندیدہ اور مکروہ پایا۔ اُس نے اس تصور کو بنی آدم کے حق میں نہایت زہرناک خیال کیا۔ چنانچہ پانچ چھ سال بعد دُنیا نے کھلی آنکھوں اس نظریے کی تباہ کاریاں بھی دیکھ لیں جبکہ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اوّل چھڑ گئی اور وہ ۱۹۱۸ء تک جاری رہی جس میں نسلِ انسانی کا اس بڑے پیمانے پر وحشیانہ قتل ہُوا کہ دنیا کی تاریخ میں کبھی پہلے اتنی خوں ریزی نہ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں آئندہ جنگ کو روکنے کے لیے لیگ آف نیشنز کا بے سود قیام عمل میں لایا گیا۔ اقبال نے MY COUNTRY RIGHT OR WRONG کے انسانیت کش نظریے کا سختی سے نوٹس لیا۔ اس نے یورپ کے رنگ، نسل، وطن اور زبان کے عناصر جہانگانہ پر مبنی معیارِ قومیت کو ٹھکرا دیا۔

اقبال نے تہذیبِ مغرب کی قباحتوں کو بروقت محسوس کرکے ان کے خلاف اس وقت اظہارِ خیال کر دیا تھا جب سلطنتِ انگلشیہ کے حدود و ثغور اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ آسٹریلیا، ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے وسیع علاقے ان کے زیرِ فرمان تھے اور کہنے والے یہ کہتے تھے کہ سلطنتِ برطانیہ کی قلمرو میں سورج غروب نہیں ہوتا۔

اقبال نے ۱۹۰۷ء میں بڑی حوصلہ مندی سے سچی بات کہہ دی۔ فرمایا ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ملاحظہ کیجئے کہ کس حزم و تیقن سے اقبال سطوتِ رفتارِ دریا کے انجام نافرجام کی خبر دے رہے ہیں ؎

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اُسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

اور پھر ۱۹۲۲ء میں جوابِ خضر کے زیرِ عنوان دنیائے اسلام کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

تُو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

یوں بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے مجددِ شرف کا راز اس کے اس عظیم کارنامے میں پوشیدہ ہے کہ اس نے مسلم قوم کو قومی تعرّف و تشخص دیا۔ قومی شناخت دی۔ اسے وہ درد عطا کیا جس میں ان کی دو صدیوں کے مرضِ غلامی سے شفایاب ہونے اور پریشاں نظری سے نجات پانے کا مداوا تھا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

ایک طرف اس قوم کو اپنا تابناک و شاندار ماضی یاد دلایا تو دوسری طرف مغرب کی چکاچوند کو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کہہ کر تہذیب نو کے منہ پر پورے زور سے تھپڑ رسید کیا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

علمی اور فکری سطح پر مغرب کے ڈھول کا پول کھولا۔ شخصی زندگی میں مغرب زدہ طبقے اور لندن پلٹ لوگوں کے برعکس درویشانہ انداز رکھا۔ تہذیبِ مغرب کا ذرہ برابر اثر قبول نہیں کیا بلکہ بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک ان کا سارا اُردو اور فارسی کلام پڑھ جائیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کا دل دھڑکتا تھا تو اسلامی غیرت سے۔ ان کی آنکھ دیکھتی تھی تو دیارِ حجاز کا فردوس نظر نظارہ اور ذہن [illegible] نگاہ سے۔ بلاشبہ علومِ شرق و غرب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑھ لیے مگر باین ہمہ اسے روح میں درد و کرب اترتا دکھائی دیتا ہے ؎

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

آخر اس کا علاج وہ رومی کے جامِ آتشیں اور قرآن کے پیامِ انقلاب آفرین کے سوا کہیں نہیں پاتا۔ یورپ سے واپسی پر بجائے مغرب زدگی کے اس نے اپنے افکار کے قرآنی ہونے کا دعویٰ کر دیا اور یہ دعویٰ اس بلند آہنگی سے کیا کہ معلوم ہونے لگا کہ عمر بھر اس نے قرآنی فکر کے پرچار کی ٹھان لی ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ۱۹۱۴ء میں اس کا یہ دعویٰ ۱۹۳۷ء تک اس طرح سوزِ دروں میں ڈھل گیا کہ اس کے کلام کا حرف حرف سرزمینِ طیبہ کے لیے مچلتے ہوئے جذبات اور گداز عقیدتوں کی آماجگاہ بن گیا۔ آخری مجموعۂ کلام کا نام بھی اسی مناسبت سے "ارمغانِ حجاز" رکھا۔

اسرارِ خودی میں اس دعوے کا رنگ، ڈھنگ اور آہنگ ملاحظہ فرمائیے اور پھر سوچیے کہ سوچ کا یہ دھارا آئندہ سالوں میں کن تلاطم خیزیوں اور گرداب انگیزیوں کا مظہر ہے

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہلِ ملت را نگہ دار از شرم

اور آخری شعر میں تو قیامت ہی ڈھا دی ہے ؎

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اواخرِ عمر میں تو اس کی دردمندی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔ ذرا اس ٹیس پر اٹھنے کی طرف [illegible]

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کے کلام میں حیات آفرینی کے وہ دوامیے بھر دیے ہیں اور جذب و رقت کے وہ طوفاں اٹھائے ہیں کہ ہر لمحہ وارفتگی و سرگشتگی کے بند ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ذرا اس سیلابِ بلاخیز کا انداز دیکھیے

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

تصور ہی تصور میں سفرِ حج درپیش ہے۔ مکہ سے مدینہ (منورہ) کی روانگی کے وقت صحرائے عرب کی مسافتوں کو

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بپایش ریگِ ایں صحرا حریر است

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی کثیر الجہات شخصیت کو جس پہلو سے دیکھا جائے وہ ایک ترشا ہوا ابو قلموں ہیرا ہے۔ وہ شاعر ہے وہ سیاست داں ہے۔ وہ قانون داں ہے۔ وہ ماہرِ اقتصادیات ہے۔ وہ مفکر ہے وہ مصلح ہے۔ وہ ایک ایسا عالم ہے جس نے علم و ادب کے سرچشموں سے اپنی تشنہ لبی کا سامان کیا ہے۔ اس کے کمالاتِ علمی و اصلاحی کا ہر پہلو امتیازی شان کا حامل ہے مگر اس کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات اور وجۂ فضیلت و عظمت یہ ہے کہ اس نے مغرب کی ظاہری چمک دمک کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ مسلمان قوم کو چودہ صدیوں کی دوری کے باوجود قرنِ اول کی دلکش اور دل گداز فضاؤں میں لے گیا۔ تہذیبِ جدید اور تمدنِ مغرب کے بودے پن کو ظاہر کیا۔ فلسفۂ خودی کا خوبصورت تصور دے کر اسلامی فکر کی توانائی اور اسلامی تمدن کے عملی مظاہر کا تفوق کھول کر بیان کیا اور سب [illegible] پیدا کر کے اسلامی فکر میں روحِ عمل اتر [illegible] (باقی صفحہ [illegible] پر)

© rasailojaraid.com